انیف کا شر

جھوٹ کے پاؤں اور غیر ملکی بیساکھیاں

ہمیں آج بھی اچھی طرح یاد ہے کہ بچپن میں جب بھی کبھی کوئی بات بڑوں سے چھپائی وہ چھپ نہ سکی۔ جھوٹ کے پلستر اور چرب زبانی کے روغن کے باوجود بلی ہمیشہ تھیلے سے باہر آجاتی۔ اس موقع پر ابا جان ہماری گوشمالی کرتے اور فرماتے انسان بنو، جھوٹ کے پاؤں نہیں ہوتے۔ پہلے پہل تو ہم سہم جاتے تھے مگر جب متعدد بار ایسا ہوا تو کسی نادیدہ خوف کے باوصف ایک لرزش خفی ہم اپنے بدن پر محسوس کرنے لگے۔ یہ بات ہمارے ذہن و دل پر نقش ہوگئی کہ جھوٹ کوئی بدنما جانور یا بدہیئت گدھ ہے جو معذور اور بے بس ہے اور چلنے پھرنے کی سکت سے عاری ہے۔ یہی وجہ ہے کہ فی الفور گرفت میں آجاتا ہے۔ اسی لیے ابا جی ہمیں جھوٹا کہتے ہیں اور ہماری ہر غلط بات پر ٹوک دیتے ہیں۔ ہمارے دل میں اس بدہیئت مخلوق کو دیکھنے کا اشتیاق بڑھتا گیا۔ ہم نے اپنی بے قراری اور اضطراری کیفیت کا اظہار کسی سے اس لیے نہ کیا کہ مبادا ہمیں اس بدشکل مخلوق کا تعلق دار سمجھ لیا جائے۔ اِنھی دنوں سکول ماسٹر صاحب نے ہم پر یہی چارج شیٹ لگا دی۔ ریاضی سے ہمیں کوئی کد نہیں۔ ثبوت اس کا یہ تھا کہ ہمارے پاس ریاضی کی دو کتابیں تھیں اور پہاڑوں کے پہاڑ پر بھی ہم چھوٹی سی عمر میں ہی چڑھ گئے تھے مگر الجبرے سے ہمارے تعلقات ہمیشہ کشیدہ رہے ہیں۔ اس لیے اے جمع بی کا مربع نہ نکال سکے۔ ویسے تو ہم اماں جی کا سیب اور گاجروں کا مربہ بھی کبھی نہیں نکال پائے۔ کیوں کہ مظروف کے ضرف یعنی مرتبان تک ہماری رسائی نہ تھی۔ اتنی لذیذ چیز جب ہمارے ہاتھ نہیں آسکتی تھی تو خشک اور سپاٹ ماسٹر چیز کیسے پلے پڑتی۔ ماسٹر جی نے جب ہوم ورک کے بارے میں ہم سے استفسار کیا اور کاپی چیک کروانے کا تقاضا کیا تو ہم نے فوراً کہہ دیا ماسٹر جی کاپی گھر رہ گئی ہے۔ ماسٹر جی نے آؤ دیکھا نہ تاؤ چھڑی اس انداز سے چلانا شروع کر دی جیسے بپھری پولیس پرامن احتجاج کرنے والوں پر لاٹھی چارج کرتی ہے۔ مارے درد کے ہم بلبلا اٹھے۔ ساتھ ہی ان کی گرجدار آواز سنائی دی: ''جھوٹا کہیں کا'' مار کھا کر اتنی تکلیف نہ ہوئی تھی مگر لفظ ''جھوٹا'' نے ہمیں ادھ موا کر دیا۔ گھر پہنچے تو بلک بلک کر روئے اور پھر امی جان کے پاؤں میں گر گئے۔ امی جان ہماری داستان حسرت سننے کی متمنی تھیں۔ اس لیے انھوں نے بارہا پوچھا کہ دلِ ناداں تجھے ہوا کیا ہے؟ اُن کے دکھ بھرے اصرار اور پرسوز گفتار کے پیش نظر ہم سسکیوں کی تمہید کے بعد شکایت اپنے لبوں پر لے ہی آئے: ''امی جان! ابا جان اور ماسٹر صاحب ہمیں جھوٹا قرار دے چکے ہیں۔ آپ تو جانتی ہیں کہ جھوٹا آدمی بدشکل جانور بلکہ بدہیئت گنجے گدھ کی طرح ہوتا ہے۔''

امی جان نے ہماری معصومیت یا بے وقوفی پر تبسم بکھیرا اور کہا کہ تم اتنی سی بات پر جوئے اشک آنکھوں سے بہا رہے ہو۔ بیٹا! تم نہ مجبور ہو اور نہ ہی معذور ہو، تجھے گدھ سے کیا مناسبت، تم شاہین بن سکتے ہو بس خاک بازی کا سبق

بھول جاؤ اور آج سے شہبازی کے جادے پر نئے عزم سفر سے چلنے کے لیے کمر باندھ لو۔ یاد رکھو! جھوٹ کا پرندہ خواہ جتنی بلندی پر بھی پرواز کرے، حقیقت کا سورج طلوع ہوتے ہی اس کے مومی پر پگھلنے لگتے ہیں اور وہ دھڑام سے زمین پر آ گرتا ہے۔ لہٰذا بیٹا! میرے ساتھ وعدہ کرو کہ ہمیشہ سچی، کھری اور بے لاگ بات کرو گے۔ اور کبھی دروغ گوئی کے پاس نہیں پھٹکو گے اور اگر کوئی کوتاہی ہو جائے یا کوئی بات بھول جاؤ تو اسے چھپاؤ گے نہیں۔ انسان سے کوتاہی اور بھول ہونا بہت اچھی بات ہے کیونکہ یہ عبرت کا تازیانہ ہے، اس سے انسان عظیم ہوتا ہے، یہ حضرت آدم علیہ السلام کی سنت ہے اور غلطی کر کے اسے صحیح ثابت کرنے پر اصرار کرنے والا خبیث ہی نہیں مردود اور لعین بھی ہوتا ہے اور یہ شیطان رجیم کا راستہ ہے۔ والدہ صاحبہ کے ارشاداتِ عالیہ کے فیض سے ہمارے دل ونگاہ روشن ہوئے اور ہم نے عملی زندگی ایسی من کی دولت پائی جو ایک دفعہ دل کی تجوری میں آئی مگر گئی کبھی نہیں بلکہ اس میں روز افزوں اضافہ ہوتا گیا۔

ہم نے اپنی والدہ سے سچ پر کاربند رہنے کا وعدہ کیا تھا اور عملی زندگی میں اسے پورا کرنے کی سعیٔ جمیلہ بھی کرتے رہے مگر دنیا اور اہل دنیا کا اتنا قریب سے مشاہدہ کیا تو ہمیشہ جھوٹ کو راجدھانی پر متمکن دیکھا۔ تاریخ اٹھا کر دیکھ لیں۔ سچ بولنے والوں کی زبانیں کاٹ دی گئیں، نیزوں پر سر لہرانے لگے، زہراب کے جام ان کا مشروب بنے۔ اگر انھیں زندہ رکھا گیا تو رسوائی اور ذلت اس طرح ان کا مقسوم بنائی گئی کہ وہ مرنے کی دعائیں مانگتے رہے۔ جھوٹ کی فصلیں اپنی پیداوار بڑھاتی گئیں اور سچ کی زمین کو شورزدہ قرار دیا جاتا رہا۔ آج بدیہی حالات بتاتے ہیں کہ کذب ودروغ کی اندھی آندھی سے سچ کا معصوم پنچھی مصلحت کے گھونسلے میں دبکا رہتا ہے۔ اسی لیے تو ایک شریف النفس شاعر بھی یہ کہنے پر مجبور ہو گیا تھا:

ہم نہ کہتے تھے کہ حالیؔ چپ رہو
راست گوئی میں ہے رسوائی بہت

چنانچہ آج ہر کوئی اس ''رسوائی'' سے بچاؤ کی تدابیر ڈھونڈ رہا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ کیا چھوٹا، کیا بڑا، کیا عالم، کیا فاضل، کیا ادیب، کیا شاعر، کیا دانشور، کیا سیاست دان ہر کوئی آج کل سچ کو جھوٹ اور جھوٹ کا سچ بنانے میں مہارت تامہ رکھتا ہے۔

ہوسکتا ہے کہ اس میں کچھ مستثنیات کو دخل ہو مگر ہمیں تو اپنی زندگی کی پچاس بہاروں میں سچائی ڈری، سہمی اور منہ چھپاتی نظر آئی۔ ہم نے جھوٹ کے کالے دیو کو زندگی کے ہر شعبے میں دندناتے دیکھا ہے۔ ۹/ مارچ کے روز ملک کے قاضی القضاۃ کے ساتھ جو کچھ ہوا سو ہوا۔ ۱۲/ مئی ۲۰۰۷ء کو ''مستقل قومی مصیبت'' کی شپرک نے عدل وآزادی کو اپنے حصار میں لے لیا۔ پچاس سے زیادہ معصوم اور بے گناہ افراد لقمہ اجل بنا دیئے گئے۔ قوم عالمی برادری میں بدنام ہوئی اور انسانیت سربازار رسوا ہوئی۔ انسان کے لہو کی ایک بوند کو نور کہا جاتا ہے مگر اس روز نور کی کئی کتابیں سڑکوں پر بکھری پڑی تھیں۔ انسانیت کے ساتھ ہونے والی اس درندگی پر شرمندگی کی بجائے سب وزراء متفق باللسان ہو کر ''سب اچھا ہے'' اور ''راوی چین لکھتا ہے'' کی رٹ لگاتے رہے۔ سچ کو قبر میں اتارا گیا اور جھوٹ کی مہتابیوں سے مطلع انوار دکھایا گیا۔

لال مسجد کے شہداء کے حوالے سے ۳/جولائی سے ۱۳/جولائی تک جتنا جھوٹ بولا گیا' اس سے جھوٹ بھی خوفزدہ ہو گیا تھا۔ ہمیں تو پہلے ہی اشتباہ تھا کہ پی پی کی بی بی کی طرح اس (جھوٹ) کے ساتھ بھی مذاکرات کا دور چل رہا ہے (مگر غنچو میاں تو کسی طرح ہماری بات سے متفق نہیں تھے وہ تو اس مذاکرات کے ڈانڈے ۱۲/اکتوبر ۱۹۹۹ء سے ملا رہے ہیں) اُسے اور اُس کے ساتھیوں کو پرتعیش زندگی گزارنے کی بار بار یقین دہانی کرائی جا رہی ہے اور معاملہ بگڑنے پر کسی نہ کسی معاملے پر شامل تفتیش کرنے کی دھمکی بھی دی جا رہی ہے۔ بسا اوقات اس کے چہرے کی زردی ماند پڑ جاتی ہے اور وہ غصے سے لال بلکہ بے حال ہو کر کانپنے لگتا ہے۔ تاہم وہ کبھی کبھار مفاہمت اور مصلحت کے ملے جلے جذبات کا اظہار کر ہی دیتا تھا مگر قلعی اس وقت کھلی جب میاں نواز اور حکومت نے اپنے اپنے داؤ پیچ لڑانے شروع کیے اور فریقین اپنی اپنی پسند کے جملوں کے ساتھ رائے زن ہوئے۔

میاں صاحب ''لاہوری بادشاہ'' ہیں (قطع نظر اس کے کہ وہ پاکستان کے بھی ''بادشاہ'' رہ چکے ہیں) انھوں نے گفتنی ناگفتنی سب باتیں پریس کانفرنس میں کر دیں اور پاکستان آنے کا عندیہ دوٹوک الفاظ میں دے دیا جو یقیناً موجودہ ''کج کلاہوں'' کے لیے ناقابل قبول تھا۔ مگر اس قوم کا کیا کیا جائے۔ یہ جانے پر لڈیا ڈالتی ہے اور آنے پر شیرینی تقسیم کرتی ہے۔ من چلوں نے ٹٹوں مٹھائی بانٹی۔ سیاسی سرگرمیاں عروج پر پہنچ گئیں۔ مجلس عمل فارغ ہی تھی۔ اس نے بھی اِدھر اُدھر دیدے گھمائے، جگہ خالی پائی اور میدان میں کود گئی۔ میاں نواز شریف نے ۱۰ستمبر کو اسلام آباد پہنچنے کا اعلان کیا تو من چلوں نے ''من کا سودا'' سمجھ کر قبول کر لیا اور اسلام آباد کی طرف روانگی کا عزم اور زادِ سفر باندھا۔ کچھ کو تو سفر سے پہلے ہی دھر لیا گیا تھا اور بہتوں کو روانگی کے وقت ''مہمان'' بنایا گیا۔ ہوائی اڈوں پر تو مکمل پہرہ تھا۔ اسلام آباد ائیر پورٹ پر تو کئی کئی میل تک پرندے کو بھی پر مارنے کی اجازت نہ تھی۔ میاں صاحب کے جیالے، من چلے، لیڈر، مرد و خواتین سب نظر بند کر دیئے گئے۔ تھانے اور حوالاتیں پر ہو گئیں اور میاں صاحب کو ''گرفتار'' کر کے سعودی عرب روانہ کر دیا گیا۔ جہاں وہ مزید تین سال ''عافیت'' سے گزاریں گے۔ دن کے اجالے میں آنیوالے کو ''تاریکی'' میں رکھا گیا۔

''پولی پولی'' شارٹ پچ گیندوں کے چھکے چوکے مارنے والے کو تیز ترین ''فل ٹاس'' کی توقع نہیں تھی۔ مگر سیاست کے کرکٹر اور کرکٹ کے سیاست دان اس عمل کو ''مباح'' گردانتے ہیں۔ چنانچہ ہم نے ٹی وی پر شیر افگن سمیت بیسیوں وزراء کو اپنے اصلی اور نقلی دانتوں سمیت مسکراتے دیکھا تو ہم سمجھے کہ شاید وہ کسی ٹوتھ پیسٹ کی تشہیری مہم کا حصہ بن کر تصویریں بنوا رہے ہیں۔ جب لارڈ نذیر نے واویلا بپا کیا کہ ''وزیراعظم سمیت تمام وزراء کذب بیانی سے کام لے رہے ہیں کہ نواز شریف برضا و رغبت واپس گئے ہیں'' تو ہمیں خبر کی صداقت کا شک ہوا اور یہ شک اس وقت یقین میں بدل گیا۔ جب رات کو ''ایوانِ صدر'' میں ''جھوٹ'' کو اپنے ساتھیوں سمیت محوِ رقص پایا۔ بے شک جھوٹ کے پاؤں نہیں ہوتے۔ وہ زیادہ دور تک نہیں چل سکتا مگر جسے امریکی بیساکھیوں کا سہارا ہو وہ ''جھوٹ'' تو بہت دور تک جانے کی سکت رکھتا ہے۔